جہادِ حُریت اور علماء دیوبند

عزیز الرحمان العظیمی

برصغیر کی تاریخ سے نسبت و واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہاں طویل عرصے تک فرنگی استعمار کا تسلط رہا ہے اور چوں کہ یہ تسلط مغل مسلمانوں کی کئی سو سالہ حکومت کا سازشوں اور مختلف شورشوں کے ذریعے خاتمہ کر کے قائم کیا گیا تھا اس واسطے بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ فرنگی سامراج یہاں سے اسلام کے اثرات ختم کرنے اور مسلمانوں کو تہ و بالا کرنے کی غرض سے ہی اس خطے میں داخل ہوا اور پھر بڑی عیاری اور کمال ہنر مندی سے رفتہ رفتہ اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہا یہاں تک کہ دہلی کے بادشاہ سے وہ رسوا کن اعلان کروانے میں کامیاب ہو گیا جس کے الفاظ یہ ہیں "خلقت خدا کی ملک بادشاہ کا حکومت کمپنی بہادر کی" تاریخ کا طالب علم جانتا ہے کہ برصغیر کے قدرتی وسائل و ذخائر تک رسائی اور اس خطے پر سے مسلمانوں کا راج (ایک خاص مفہوم میں سہی) ختم کرنے کے دو اساسی مقاصد ہی کی خاطر برطانوی سامراج طویل منصوبہ بندی اور انتھک جد و جہد کے بعد اس علاقے پہ قابض ہوا تھا چناں چہ اس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوا کہ مسلمانوں کی حکومت ختم ہو گئی اور آئندہ کے لیے اس کے امکانات دور دور تک ناپید ہو گئے اور جو رہی سہی اسلامیت اب باقی ہے یہ ان "ملاؤں" کا احسان ہے جنھوں نے مسلمانوں کی ناؤ کو ڈوبتا ہوا اور "اسلامیت" کی بقاء کو خطرے میں دیکھ کر مسجدوں اور خانقاہوں میں بیٹھ کر ذکر کرنے نیز عشق و مناجات الٰہی وعظ و تلقین اور دعا و استغفار جیسے معمولات کو مسلمانوں کی تقدیر بدلنے کے لیے ناکافی سمجھا اور اپنی تمام تر بے سر و سامانی کے باوجود دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے فرعون صفت حکمرانوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور پھر ارض و فلک نے دیکھا کہ چند بوریا نشینوں کی اس جماعت نے طاغوت کی دھجیاں اڑا دیں۔ تاریخ ہند و برصغیر اپنا دھارا بدلنے والے ان کرداروں پہ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ ویسے تو ہند کی مردم خیز سرزمین پہ ہر عہد میں بے شمار ایسے ایسے رجال کار نے جنم لیا ہے جن میں سے ہر ایک نے ایک مستقل تاریخ رقم کی ہے۔ تاہم تحریک حریت میں علماء ہند اور خاص کر انیسویں صدی کے نصف آخر میں قائم ہونے والے مینارۂ نور دار العلوم دیوبند کے بانیوں اور فرزندوں کے "طائفہ منصورہ" نے جو کردار ادا کیا ہے وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

تاریخ کے آئینے میں اگر اہالیان برصغیر کا کوئی کردار و کارنامہ سب سے زیادہ اُجلا نظر آ رہا ہے تو وہ یہی علماء دیوبند کی جد و جہد آزادی ہے چنانچہ یہ ان مردانِ خدا کی کتاب زندگی کا وہ سنہرا باب ہے جس پر بد سے بدتر اغیار و اعداء بھی انگشت نمائی کی جسارت نہیں کر سکتے کہ آسمان پہ تھوکنے والا درحقیقت اپنے ہی منہ پہ تھوکتا ہے اور سورج یقیناً خاک ڈالنے سے نہیں چھپتا۔ تاہم پھر بھی اس دنیا خانے میں ایسے "عباپوشوں" کی بھی کوئی کمی نہیں جن کو کسی حادثے نے نمودار کیا تو پھر وہ اپنے بے میل و محل وجود کے لیے کسی سہارے کی تلاش میں لگ گئے اور جب تاریخ کے معروف اور نامور کرداروں کے ساتھ وہ اپنا کوئی بھی رشتہ رابطہ قائم کرنے میں ناکام ہوئے تو انھوں نے تاریخی حقائق کو مسخ کرنا شروع کر دیا اور دوسروں کی شخصیت پہ داغ دھبے لگا کر اپنی جھوٹی عزت و شہرت کی عمارت تعمیر کرنے میں لگ گئے کہ اس طریقے سے

اگر وہ اپنا قد نہ بڑھا سکیں تو کم از کم دوسروں کا قد تو گھٹا دیں گے اور یوں کسی نہ کسی طرح توازن قائم ہو جائے گا۔ اسی صنف کے کچھ لوگ آج تک علماء دیوبند پر تحریک پاکستان میں عدم شرکت و موافقت کا الزام لگا کر ان پر کیچڑ اچھالتے رہے اور اب انہیں "بے نواؤں" کے جوہر لطیف کو ایک اور ترکیب سوجھی ہے کہ پوری دیدہ دلیری سے علماء دیوبند کو تحریک آزادی اور جہادِ حریت سے بے دخل کرنے کی ناکام و ناروا کوشش کر رہے ہیں بلکہ دار العلوم دیوبند اور علماء دیوبند کو انگریز کی پیداوار تک کہنے میں بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔ معلوم نہیں ان کا یہ "گناہ بے لذت" کیا برگ و بار لاتا ہے۔ تاہم دیوبند کے "شجرہ طیبہ" اور اس کے خوشہ چینیوں کے متعلق اول فول بکنے کا کوئی بھی مقصد ہو اس کی اجازت کبھی کسی کو نہیں دی جاسکتی کہ یہ اہل حق کے دینی تشخص کو مجروح کرنے کی غیر اخلاقی اور غیر آئینی کوشش ہے اور پھر کسی ذی عقل اور ہوش مند انسان کو ہمارے ملک کے حساس حالات میں ان جیسی بے ہودگیوں کو چھیڑ کر قدرے امن و یکجہتی کی فضا کو مکدر کرنا کسی طور زیب نہیں دیتا۔

"دار العلوم دیوبند کو انگریز نے قائم کیا" یہ بالکل ایسا ہی بے تکا دعویٰ ہے جیسے کوئی ستم کیش کہے "صلاح الدین ایوبیؒ کو صلیبیوں نے کھڑا کیا تھا۔" یا جیسے کوئی شوخ بولے "مجدد الف ثانیؒ کو اکبر نے ایجاد کیا" اب ایسے تہی مغزوں کے ان دعوؤں میں کتنی جان ہے جو ان کی طرف التفات کیا جائے؟ مگر پھر بھی ضابطہ یہ ہے کہ بدیہی حقائق اور مسلم واقعات کے خلاف بولنے والوں کی بھی تردید کی جاتی ہے اور ان کے دعوؤں اور مقدموں کا جائزہ لیا جاتا ہے تاکہ وہ پروپیگنڈے کے بل پر رائے عامہ کو گمراہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے اور سادہ لوح مسلمان ان کی عیاری اور حقیقت پوشی کے بھینٹ نہ چڑھیں اسی تناظر میں جب دار العلوم دیوبند کے قیام اور اس کے کردار کو تاریخ کے صفحات میں تلاش کیا جاتا ہے تو ایک عجب خوشگوار سی حیرت ہوتی ہے کہ مدعی جنہیں "بے بہرہ" گردانتا ہے تاریخ اسی کو "بہرور" قرار دیتی ہے اور معاندین نے دیوبند والوں کا دامن جن کمالات سے خالی ثابت کرنے کی کوشش کی مورخ نے اسی کو ان کا طرۂ امتیاز بتایا ہے۔

ہندوستان کی کوئی بھی تاریخ اٹھائی جائے اور فرنگیوں کے ہندوستان سے نکلنے کا کوئی بھی "تذکرہ" پڑھا جائے دیوبند کے سرفروشوں کے نام سرفہرست نظر آئیں گے اور ان علماء کی اگر کسی صفت پہ پردہ نہیں ڈالا جاسکتا ہے تو وہ یہی ان کا جہاد حریت میں حصہ لینا ہے کہ اس کے بغیر ان کا ذکر ادھورا رہتا ہے اور اُن کے بغیر جہاد آزادی کی تاریخ تشکیل دینا ایک ایسا خواب پریشان ہے جس کی تعبیر ناممکن ہے۔

دار العلوم دیوبند کیا ہے اور اسے کب اور کیسے قائم کیا گیا؟

دائرہ معارف اسلامیہ کے جلد نمبر ۹ میں لفظ "دیوبندی" کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"سلطنت مغلیہ کے خاتمے اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی دینی اور علمی ضرورت کے پیش نظر یہ درسگاہ قائم کی گئی تھی۔ اس کے بانیوں کے پیش نظر اہم مقاصد یہ تھے۔

❶ آزادئ ضمیر اور اعلائے کلمۃ الحق ❷ مسلمانوں کو ایک جمہوری عوامی تنظیم میں پرونے کی جدوجہد کرنا ❸ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کے مسلک کی حفاظت و اشاعت ❹ مسلم معاشرے سے خود غرضی اور استبداد کا خاتمہ ❺ علوم دینیہ کا احیاء ❻ علوم عقلیہ کی صحیح تربیت ❼ دین میں مہارت کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم کے تقاضے پورے کرنے والے علماء تیار کرنا۔

درسگاہ کی مالی ضروریات کے سلسلے میں بھی مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے آٹھ اصول مقرر کیے

جن کا مقصد یہ تھا کہ حکومت وقت اور امراء واغنیاء کے تسلط سے درسگاہ آزاد رہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت برطانیہ اور برہمنی حکومت کی خواہش کے باوجود "دارالعلوم" نے کسی سے آج تک گرانٹ لینا پسند نہیں کی۔" (ص ۶۲۲)

غور کیا جائے تاریخ جس مرکز علم ورشد کو ایسے شاندار الفاظ میں یاد کرتی ہے اس کے متعلق "قیل وقال" کی کتنی اہمیت رہتی ہے کیا ماضی قریب کے اس عظیم واقعے اور ناقابل انکار حقیقت کو سینہ زوری سے جھٹلایا یا کینہ پروری کے پردوں میں چھپایا جاسکتا ہے؟ یا محض اپنے مریض دلوں کی تسکین کی خاطر ایسی بے سروپا باتیں کہی جارہی ہیں۔

کہنے والوں نے بلا تکلف یہ بھی کہہ دیا کہ "دارالعلوم دیوبند" امت میں اختلاف پیدا کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ دائرہ معارف اسلامیہ کے درجہ بالا اقتباس اس اتہام کی قلعی کھولنے کے لیے کافی ہے تاہم اسی عنوان کے تحت کتاب مذکور کے مندرجہ ذیل الفاظ بھی ملاحظہ ہوں:

"مولانا محمد قاسم نانوتوی (رحمہ اللہ) نے ایک موقعہ پر کہا "فی زماننا کفار کا غلبہ ہے وقت نہیں ہے کہ مسلمانوں میں تفریق کو ہوا دی جائے جس سے ان کا کلمہ متفرق ہو کر مزید ضعف پیدا ہو بلکہ توڑنے کے بجائے جوڑنے کی فکر کی جائے۔" (ص ۶۲۳)

حقیقت یہ ہے کہ دارالعلوم اور علماء دیوبند عبارت ہی "انگریز دشمنی" سے ہیں۔ ان کی فرنگی سامراج سے شدید نفرت وعداوت اور اس کے خلاف تاریخی جدوجہد آج مسلمانان برصغیر کے لیے اور دنیا بھر کے حریت پسندوں کے لیے ایک نمونے اور رہنما کی حیثیت رکھتی ہے جس پر ان کے فرزندوں کو بجا طور پر فخر کرنے کا حق ہے اور یہ اکابرین خود بھی اسے اپنا قیمتی اثاثہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے اپنی زندگی کے قیمتی لمحات اور اپنی تمام تر صلاحیتیں وقت کے اس عظیم مستبد اور خطرناک طاغوتی قوت کے خلاف استعمال کیں اور عزیمت کے اس راستے پہ چلے جس سے بسا اوقات ان کے متعلق "غلو" یا "جنون" تک کا شائبہ ہوتا ہے اور اس انگریز دشمن ذہنیت کے باعث بسا اوقات بعض اہم ترین چیزیں ان کے ہاں ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ ہمارے اس مدعی کی مندرجہ ذیل شہادتوں سے پوری پوری تائید وتصویب ہوتی ہے۔

صاحب دائرہ معارف اسلامیہ جلد نہم "تحریک پاکستان" میں علماء دیوبند کی شمولیت اور عدم شمولیت نیز اس کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دیوبندی علماء کرام نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے نزدیک دارالعلوم کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد ملت اسلامیہ کو جہاد آزادی اور ہندوستان سے انگریز کو نکالنے کے لیے تیار کیا جائے۔ آزادئ ہند کے لیے "ریشمی رومال" کی تحریک شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ ہی نے منظم کی تھی۔ تحریک خلافت میں بھی ان علماء نے بڑا حصہ لیا۔ قیام پاکستان سے کچھ قبل اس جماعت کے دو حصے ہو گئے ایک انگریزوں کی مخالفت کے جوش میں اتنا بڑھ گیا کہ مسلم لیگ کی تائید سے قاصر رہا۔ اس کے برعکس مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور مفتی محمد شفیعؒ صاحب وغیرہ نے مسلم لیگ کے موقف کی تائید کی اور تحریک پاکستان میں بھی حصہ لیا۔ چنانچہ زیادہ تر انھیں کی وجہ سے برصغیر کی تقسیم سے قبل صوبہ سرحد میں ہونے والے

استصواب رائے عامہ میں مسلم لیگ کو کامیابی نصیب ہوئی۔"

(دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۹، ص ۶۲۴، طبع اول پنجاب)

اس اقتباس سے علماء دیوبند کے خلاف تحریک پاکستان میں عدم شمولیت اور انگریز کے خلاف جہاد میں عدم شرکت کے ہر دو الزامات کی قلعی پوری طرح کھل جاتی ہے اور حقیقت آفتابِ نیمروز کی طرف عیاں ہو جاتی ہے۔

اسی طرح شیخ الہندؒ کے وہ الفاظ بھی یاد رکھنے کے قابل ہیں جو انھوں نے اپنے ایک خادم خاص مولانا عزیز گلؒ کی خواہش کے جواب میں فرمائے تھے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ کے مرقد کے قریب کسی کی تدفین ہو رہی تھی کہ میں نے ازراہ عقیدت و محبت اپنے شیخؒ سے کہا آپ تو اس جگہ (حضرت کی پہلو میں) کو اپنے لیے وصیت کر کے متعین فرمادیں۔ حضرت نے فرمایا یہ تو آپ کی خواہش ہے ذرا مجھ سے بھی پوچھو کہ میں کیا چاہتا ہوں:

"میری تو خواہش ہے کہ میدان جہاد میں اس طرح مارا جاؤں کہ ہاتھ کہیں کٹا پڑا ہو سر کہیں ہو دھڑ کہیں پڑا ہو میں تو چاہتا ہوں کہ قبر کا نشان ہی نہ بنے۔"

(الاشرف تحریک آزادی میں علماء حق کا کردار، نومبر، دسمبر ۱۹۹۷ء)

اور یہ ان کے جذبات و احساسات کی وہ کیفیت تھی جس کا ان کے دشمنوں کو بھی اندازہ تھا اور وہ اس کا اعتراف بھی کرتے تھے۔ چنانچہ اس وقت کے یوپی کے انگریز گورنر سر جیمس نے شیخ الہند کے متعلق کہا تھا۔ "اس شخص کی اگر بوٹی بوٹی بھی کر دی جائے تو ہر بوٹی سے انگریزوں کی عداوت ٹپکے گی۔"

انصاف سے کہا جائے کیا یہ عشق و ایمان، جذبۂ جہاد اور شوق شہادت کی وہی کیفیت نہیں جس کا آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل شمع نبوت کے ایک پروانے (حضرت خبیب رضی اللہ عنہ) نے اس وجد آفرین انداز میں اظہار فرمایا تھا:

فلست ابالی حین أقتل مسلما

علی أیّ شق کان فی اللّٰہ مصرعي

وذلك فی ذات الالٰہ وإن یشا

یبارك علیٰ أوصال شلوٍ ممزّعي

پھر فرنگی سے نفرت و عداوت کا یہ بے نظیر جذبہ دیوبند کے کسی ایک عالم میں نہیں تھا کہ اسے نادر کہہ کر رد کیا جا سکے یا کسی اور سبب کا اثر قرار دے کر اس کی اہمیت گھٹا دی جائے بلکہ بلا فرق و امتیاز تمام علماء دیوبند کے رگ و ریشے میں اولوالعزمی اور طاغوت دشمنی کا یہ جذبہ رچ بس چکا تھا اور ظاہر ہے جب اس مرکز صدق و صفاء کی بنیاد ہی انگریز دشمنی پر رکھی گئی تھی تو پھر اس کے در و دیوار سے فرنگی دشمنی کے چشمے کیوں نہ پھوٹتے اور اس کے فرزندوں کے اعصاب پہ انگریز کے خلاف جہاد کا یہ جنونی جذبہ چھایا ہوا کیوں نہ ہوتا جو انہیں دوسرے معاصرین سے ممتاز کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیوبند کے اکابر و اصاغر میں دوسری وجوہ سے کتنا ہی تفاوت کیوں نہ ہو جذبہ جہاد و حریت بہر حال ان سب کا مشترکہ اور متوارثہ اثاثہ ہے جیسے کہ علامہ خلیق احمد نظامی فرماتے ہیں:

"انیسویں صدی کی تیسری اہم تحریک، آزادیٔ وطن کی تھی اس سلسلہ میں خود حاجی (امداد اللہ) صاحب اور ان کے منسلکین نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ ہندوستان کی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ آزادی وطن کے جس جذبے نے حاجی صاحبؒ کے قلب و جگر کو گرمایا تھا وہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے پہلو میں شعلہ بن گیا تھا وہ اور ان کے رفقاء اور تلامذہ نے ہندوستان سے انگریزی حکومت کا اقتدار ختم کرنے کے لیے جن مصائب کا سامنا کیا تاریخ ہند کا کوئی دیانتدار مورخ ان کو بھلا نہ سکے گا۔"

(تاریخ مشائخ چشت، ص ۲۳۲)

"حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور ان کے خلفاء" نامی کتاب کے مصنف بھی اس سے ملے جلے الفاظ میں اس کا ذکر فرماتے ہیں:

"علامہ محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی ۱۸۵۷ء میں شاملی اور تھانہ بھون وغیرہ میں جہاد حریت کے علمبردار رہے تھے اور مولانا امداد اللہ مہاجر مکی کی سرپرستی میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں کر چکے تھے۔ برطانوی دور میں وہ خاص طور سے معتوب رہے تھے لیکن خدا نے گزند سے ہمیشہ محفوظ رکھا۔"

(حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور ان کے خلفاء، ص ۳۵)

یہی (۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی) وہ معرکہ ہے جس میں حافظ ضامن رحمہ اللہ خلعت شہادت سے بہرہ مند ہوئے تھے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی نو ماہ تک اسیر فرنگ رہے تھے اور حضرت نانوتویؒ کو بھی گولی لگی تھی جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور اس کے علاوہ ہزاروں علماء نے حصہ لیا تھا اور گراں قدر قربانیاں دی تھیں۔

ذیل میں دی گئی عبارات اس کی شاہد عدل ہیں۔

حضرت نانوتوی کے متعلق:

"۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے امیر لشکر حضرت نانوتوی تھے۔ انتہائی جرأت اور بے جگری کے ساتھ آپ نے دست بدست جنگ کی۔ کنپٹی پر ایک گولی بھی لگی۔" (سوانح قاسمی، نمبر ۲، ص ۱۶۰)

حضرت گنگوہی کے متعلق:

"رشید احمد گنگوہیؒ نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں حضرت نانوتویؒ کے دوش بدوش قائدانہ حصہ لیا اور نو ماہ تک اسیر فرنگ رہے۔" (امداد اللہ مہاجر مکی اور ان کے خلفاء، ص ۳۲)

دیگر کے متعلق:

"مظفر نگر میں مولانا امداد علی نے علم جہاد بلند کیا۔ کیرانہ میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے یہ فرض پورا کیا اور علی گڑھ میں مولانا نسیم اللہ نے۔" ("جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، ص ۱۸۵)

مگر علماء کے ان تمام تر مساعی اور مؤمنانہ جدوجہد کے باوجود مسلمانوں کو اس معرکہ میں بھی شکست ہوئی۔ ۱۸۳۰ء کی تحریک انقلاب (جس کی قیادت سید احمد شہیدؒ فرما رہے تھے) کی طرح کئی فتوحات اور ابتدائی کامیابی کے بعد اور اسی شکست سے ان "نفوس قدسیہ" نے سبق سیکھ کر نئی حکمت عملی اپنائی، مسلمانوں کی ذہنی اور فکری تربیت کے لیے ۱۸۶۶ء میں دار العلوم قائم کیا اور دیگر جامعات کا جال بچھانا

شروع کیا۔ فرنگی کے خلاف نفرت عام کرنے اور جہاد حریت کو مزید منظم کرنے کی شبانہ روز کوششیں شروع کیں۔ نیز آہنی جہاد کے ساتھ آئینی جدوجہد بھی تیز کردی اور دیگر ہم وطنوں کو ساتھ ملا کر فرنگی کو ملک سے نکالنے کی راہ چلنے کی انہیں پہلے سے زیادہ اہمیت و ضرورت کا احساس ہوا، چنانچہ ۱۸۸۵ء کو کانگریس قائم کی گئی۔ اسی طرح تحریک ترک موالات، تحریک خلافت، تحریک ریشمی رومال اور تحریک دارالعلوم دیوبند جیسی مؤثر تحریکیں اس مبارک سلسلے کی تاریخی کڑیاں ہیں۔ ڈاکٹر زبیر احمد صاحب نے اپنے اس جملے میں اسی وقت کا ذکر کیا۔

عہد انگلیسی میں یہاں دیوبند اور ندوۃ العلماء یکے بعد دیگر تعلیم علوم اسلامیہ و عربیہ کے مرکز بنے۔ (ارمغان علمی، لاہور، ص ۹۵)

بہر حال یہ دارالعلوم دیوبند کے مقاصد و اہداف اور علماء دیوبند کی جدوجہد آزادی اور انگریز کے خلاف جہاد کا ایک مختصر سا تذکرہ تھا جسے قلم برداشتہ لکھا گیا۔ اس مختصر سے مضمون میں اس "داستان مہر و وفا" کا احاطہ تو کیا۔ اجمالی خاکہ بھی پیش کرنا ناممکن ہے کہ تاریخ کے سینکڑوں صفحات پر اس کاروان عزیمت کے احوال و وقائع پھیلے ہوئے ہیں اور برصغیر کا تو شاید ہی کوئی معقول اور صاحب دل انسان ہوگا جس نے ابھی پچھلی صدی میں گزرے ہوئے اس طوفان بلاخیز اور اس کے تیز و تند تھپیڑوں سے نبرد آزما "کشتی حق" کے ان بلند حوصلہ ناخداؤں کے متعلق کچھ سنا یا پڑھا نہ ہو۔

تاہم اختصار کے پیش نظر ہم آخر میں صرف تین مزید واقعات اجمالاً ذکر کر کے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

پہلا واقعہ مادر علمی دارالعلوم دیوبند سے متعلق ہے یہ ۱۸۷۵ء کی بات ہے جس وقت برطانوی (فرنگی) سامراج کا ہندوستان پر راج تھا "سر جان اسٹریچی" اتر پردیش (بھارت کا ایک صوبہ) کا گورنر تھا اس نے اپنے ایک معتمد جان پامر کو اس غرض سے دارالعلوم دیوبند بھیجا کہ وہ خفیہ طور پھر تحقیقات کر کے حکومت کو رپورٹ پیش کرے کہ دارالعلوم کے قیام کا مقصد کیا ہے اور مسلمان علماء دارالعلوم کے پس پردہ کس فکر و عمل میں مصروف ہیں۔ جان پامر نے دارالعلوم کا ایک طویل مطالعاتی دورہ کیا اور تمام شعبوں کی کارکردگی اور جملہ سرگرمیوں پر مشتمل ایک رپورٹ پیش کی جس کا تاریخ میں تفصیل سے ذکر ہے اور وہ رپورٹ کئی ایک وجوہ سے ایک اہم ترین اور معنی خیز دستاویز ہے۔ مگر ہم یہاں اس کے وہ چند کلمات نقل کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے موضوع سے متعلق ہیں اور انھوں نے اپنے ایک دوست کے نام لکھے ہوئے خط میں اس سفر سے متعلق تحریر کیے ہیں وہ لکھتا ہے۔

"لیفٹننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی کے ساتھ دورے میں ۳۰ جنوری ۱۸۷۵ء کو دیوبند میں قیام ہوا، گورنر نے مجھ سے کہا کہ یہاں دیوبند میں مسلمانوں نے گورنمنٹ کے خلاف ایک مدرسہ جاری کیا ہے تم اجنبیانہ طور پر اس مدرسہ میں جا کر پتہ لگاؤ کہ کیا تعلیم ہوتی ہے اور مسلمان کس فکر میں لگے ہوئے ہیں۔" (تاریخ دارالعلوم دیوبند، جلد اول، ص ۱۷۶)

غور کیا جائے "گورنمنٹ کے خلاف" کا یہ جملہ دیوبند کے کسی خوشہ چین یا جذباتی فیض یافتہ کا نہیں خود گورنمنٹ کے نمائندہ کا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جائے کہ "دارالعلوم" کن نے بنایا تھا اور کن کے خلاف تھا۔

"قیاس کن ز گلستان من بہار مرا"

دوسرا واقعہ آزادی ہند کے سرخیل شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ کا ہے۔ جس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ۔

تجارت کے نام پہ ہندوستان میں آئے ہوئے فرنگیوں نے جب ملک کو لوٹنے اور مسلمانوں کو تہہ و بالا کرنے کی انتہا کر دی۔ دین و شعائر دین کی تخریب و توہین اور مسلمانوں سے ۱۸۵۷ء کا انتقام لینے میں دن بدن تیزی لاتے رہے اور ادھر طرابلس اور بلقان کی جنگیں بھی

چھڑ گئیں۔ مختلف مسلم ممالک کو برطانوی سامراج نے تشدد اور سازشوں سے لہولہان کیا تو ادھر علماء حق کا پیمانہ صبر وضبط بھی لبریز ہوا اور اب ان کے لیے خاموش بیٹھنا یا اطمینان سے زندہ رہنا ناممکن ہوا۔ چنانچہ وہ نتائج و عواقب کی پرواہ کیے بغیر انگریز کے خلاف فیصلہ کن معرکہ لڑنے میدان عمل میں اترے۔ اس قافلہ حریت کے روح رواں حضرت شیخ الہندؒ تھے۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ اپنی خود نوشت سوانح حیات میں اس پس منظر کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس اللہ سرہ العزیز جن کی گہرائی نظر واقعات عالم اور بالخصوص ہندوستان اور ترکی پہ زیادہ مرکوز رہتی تھی۔ ان واقعات سے اس قدر متاثر ہوگئے کہ ان کے لیے آرام و چین تقریباً حرام ہوگیا۔ تاریخ دانی اور گذشتہ واقعات ہند و ممالک اسلامیہ ایشیا و افریقہ اور یورپ وغیرہ پر غائرانہ نظر نے ان کو مجبور کر دیا کہ وہ مذکورہ بالا حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان عمل میں نہ صرف خود نکلے بلکہ ہندوستان کے ذی اثر علماء و قائدین کے ساتھ مل کر ایک ایسی سیاسی تحریک چلائیں جس سے انگریز قوم کے منحوس قدم ہندوستان سے نکل جائیں تاکہ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ ممالک اسلامیہ و افریقہ وغیرہ سے بھی اس کا اقتدار ختم ہو جائے۔" (نقش حیات، بحوالہ مدنی واقبال نمبر، ص ۲۳)

چنانچہ اس موقع پہ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی مشہور زمانہ تحریک انقلاب شروع کی جس نے تاریخ میں "تحریک ریشمی رومال" کے نام سے شہرت پائی۔ یہ تحریک دار صل دیوھیکل برطانوی سامراج کو ہندوستان سمیت تمام بلد و اسلامیہ سے بے دخل کرنے اور اس کے خلاف بغاوت کو منظم اور مؤثر بنانے کے لیے معرض وجود میں آئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک حجاز مقدس، استنبول، کابل، صوبہ سرحد، یاغستان، ماسکو اور ہندوستان کے طول و عرض میں زیر زمین پھیلا دی گئی اور بہت بڑے پیمانے پر وسیع منصوبوں کے تحت کام شروع ہوا۔ حضرت شیخ الہند اور ان کے بلند پایہ رفقاء نے اعصاب شکن حالات کا مقابلہ کیا، انتھک محنتیں کیں، ناقابل برداشت مصیبتیں جھیلیں اور اس جدوجہد کے کامیابی کے آثار اور خوشگوار ثمرات بھی دکھائی دے رہے تھے۔ مگر مشیت ایزدی کو کچھ اور منظور تھا کہ بعض خائنوں اور جاسوسوں کی خباثت کے باعث تحریک کے متعلق خفیہ راز کھل گئے، پھر کیا تھا انگریز بپھر گیا پوری رعونت اور وحشت انگیز طریقے سے تحریک کو کچل دیا گیا اور اس کے نیٹ ورک کے بخیے ادھیڑ دیئے گئے۔ شیخ الہند کو ان کے رفقاء سمیت گرفتار کر لیا گیا اور گھما پھرا کے مالٹا جیل میں نظر بند کیا گیا جہاں یہ اولیاء اللہ عرصے تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ تاریخ دھیمی رفتار سے ایک اور رخ پہ جا رہی تھی اور اگر ستمگروں نے اس کے سامنے بند نہ باندھ لیے ہوتے تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا مگر

"اے بسا آرزو کہ خاک شد"

دلدوز واقعہ کا مختصر سا احوال مرتب "شہاب ثاقب" کی زبانی کچھ یوں ہے:

"اس اثناء میں حاکم حرمین شریف حسین نے انگریزوں کی سازش سے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ شریف حسین نے آپ (شیخ الہند) اور آپ کے ہمراہیوں کو جن میں مولانا حکیم نصرت حسین صاحب، مولانا عزیز گل صاحب، مولانا وحید احمد صاحب مدنی شامل تھے (اور حجاز میں تحریک کے سلسلے میں قیام پذیر تھے وہیں) گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا یہ گرفتاری ۱۳۳۵ھ کو عمل میں آئی۔ حضرت شیخ

الاسلام (مولانا مدنی) انگریزوں کے خلاف (حجاز میں جہاں وہ مسجد نبوی ﷺ میں اٹھارہ سال سے درس حدیث دینے میں مشغول تھے) تقریر کرنے کے جرم میں گرفتار کیے جا چکے تھے۔ ان کو بھی جدہ پہنچا کر حضرت شیخ الہند کے ہمراہ کر دیا گیا۔ آہ:

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب جمے گی مل بیٹھیں گے دیوانے دو

بعد ازاں ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ بمطابق ۱۴ جنوری ۱۹۱۷ء کو یہ اسیران ظلم و ستم مصر روانہ کر دیئے گئے جہاں ایک خاص سیاسی قید خانہ میں ان کو رکھا گیا۔ ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ کال کوٹھری میں بند کر دیا گیا تھا۔ تقریباً ہر شخص سمجھتا تھا کہ پھانسی کی سزا ہو گی۔ لیکن مشیت ایزدی میں آپ حضرات کی حفاظت تھی اس لیے بجائے پھانسی اسارت مالٹا کی سزا تجویز ہوئی۔ اسارت مالٹا کی مدت تقریباً تین سال (سات ماہ) ہے۔"

(مقدمہ شہاب ثاقب، ص ۱۶۲)

یہ ہیں وہ ارباب وفا جو اپنے متعلق بجا طور پر کہہ سکتے ہیں:

درخور قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

تیسرا واقعہ شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمہ اللہ کا ہے۔ یہ بھی دراصل اسی داستان عشق و وفا کی اک کڑی ہے۔

شیخ الہند کی جب مالٹا سے رہائی ہوئی تو ہندوستان پہنچ کر آپؒ نے تحریک آزادی (خلافت کمیٹی) کی مکمل حمایت کا اعلان کیا اور تمام تر سابقہ صعوبتوں اور موجودہ رکاوٹوں کے باوجود اس میں مردانہ وار حصہ لیا۔ تحریک "ترک موالات" کی بھی آپ نے بھرپور تائید فرمائی تھی اور آپ کے ساتھ حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی سمیت تقریباً پانچ سو اکابر علماء ترک موالات کے سلسلے میں فتوی دے چکے تھے اور تاریخ نے شیخ الہندؒ کا یہ جملہ سنہری حروف میں محفوظ کیا ہے "اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہے جس سے ترک موالات فرض ہے" (بحوالہ مدنی و اقبال نمبر، ص ۴۷) اب آپ کا تربیت یافتہ شاگرد حضرت مدنی آپ کی جانشینی کا بوجھ پوری طرح اٹھا چکے تھے اور انگریز کے خلاف کامل ہمت اور عزیمت سے محرک تھے۔

اس سلسلے میں ۸، ۹، ۱۰ جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں خلافت کمیٹی کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں حضرت مدنیؒ بھی شریک تھے۔ اس اجلاس کے احوال اور اس کے بعد جو کچھ ہوا (وہ تاریخ کا ایک منفرد واقعہ ہے) اسی کی ایک جھلک پیش خدمت ہے:

"اس اجلاس میں حضرت شیخ الاسلام (مولانا مدنی) رحمہ اللہ نے ایک تجویز پیش فرمائی۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ انگریز کی فوج میں ملازم رہنا بھرتی ہونا یا اس کی دوسروں کو ترغیب دینا حرام ہے اور ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ جو لوگ فوج میں ہیں ان تک یہ حکم پہنچائیں اور فوج سے علیحدہ ہونے کی ترغیب دیں۔ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی وغیرہ نے اس تجویز کی تائید کی..... اس کے بعد آپ کو گرفتار کیا گیا اور آپ کے خلاف انگریز نے مقدمہ چلایا، آپ نے ججوں کے روبرو یہ بیان دیا۔ "چونکہ لائڈ جارج اور چرچل نے یہ

اعلان کر دیا تھا کہ یہ جنگ اسلام اور برطانیہ کے درمیان ہے لہٰذا ہمارا اہم ترین فرض ہے کہ ہم اعلان کر دیں کہ اسلام دشمن طاقتوں سے مقابلہ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ اگر گورنمنٹ مذہبی آزادی کے سلسلے میں ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کی تعمیل نہیں کرنا چاہتی تو ہر مسلمان اپنے مذہب پر جان قربان کرنے کے لیے تیار ہو گا (تم اپنی خو نہ بدلو گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں) اور میں پہلا شخص ہوں کہ اپنی جان قربان کر دوں گا (مولانا محمد علی جوہر بھی اس مقدمہ میں ماخوذ تھے اور اس وقت کمرۂ عدالت میں موجود تھے اس موقعہ پر جب حضرت شیخ مدنیؒ نے اپنی بے مثال جرأت کا مظاہرہ کیا تو انہوں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر جا کر حضرت مدنیؒ کے پاؤں چوم لیے (مدنی واقبال نمبر، ص ۱۲۷)

اس کے بعد آپ کو دو سال قید بامشقت کی سزا سنادی گئی اور اس پر عمل در آمد ہوا۔"

("شہاب ثاقب" ص ۱۶۷)

یہ اس طویل مقدمہ کا ایک مختصر سا اقتباس ہے جس میں حضرت مدنیؒ نے بے مثال ایمانی غیرت اور جرأت کا مظاہرہ فرمایا اور انگریز ججوں کے سامنے اظہار حق کا ولولہ انگیز کارنامہ انجام دیا اور یوں یہ ابوالکلام آزاد کے "قول فیصل" کی طرح ایک تاریخ ساز دستاویز کی صورت اختیار کر گیا۔

تاریخ کے اوراق ہمارے اکابر کے اس جیسے بے شمار واقعات اور کارناموں سے بھرے پڑے ہیں۔ ان فرزندان حق وصداقت کی زندگیوں کا ایک ایک گوشہ اس قدر ایمان افروز اور روح پرور ہے جس کی مثال قرون وسطیٰ میں بھی مشکل سے ملے گی اور جہاں تک انگریز کے خلاف جہاد کا تعلق ہے تو اس کا تو بیڑا ہی انھوں نے اٹھایا۔ دوسری طرف تو ملت فروشوں اور انگریز کے کاسہ لیسوں کا وہ ٹولہ ہے جن کی زندگیاں حق اور اہل حق کو نیچا دکھانے کے لیے تو وقف تھیں البتہ کردار کے متاع سے وہ بالکل بے بہرہ اور اس میدان میں خالص فرومایہ ہیں اور کسی کا یہ شعر جیسا کہ انہی کے متعلق کہا گیا ہو۔

قافلے گزریں وہاں سے کیوں کر سلامت واعظ
ہو جہاں راہزن اور راہنما ایک ہی شخص

بہر کیف یہاں سر فروشوں کے اس قافلے کے احوال واخبار میں سے "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر یہ چند باتیں قلم بند کی گئیں۔ جن کی ترتیب میں شاید کوئی ربطً وسلیقہ بھی نہ ہو اور طوالت بھی کچھ زیادہ ہی ہو مگر "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم" کے مصداق ایسا کرنا کسی حد تک ناگزیر بھی تھا۔ بہر حال حقیقت سے بے خبر یا جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لینے والوں کے سامنے "علماء دیوبند" کی حیات مبارکہ کا یہ ایک زرین ورق تشکر وافتخار کے اس اعلان کے ساتھ پیش نظر کیا جا رہا ہے۔

اولئك أبائی فجئنی بمثلهم

☆☆☆